درس ۲۶

اُمت مسلمہ سے خطاب کے ضمن میں
قرآنِ حکیم کی جامع ترین سورت
اُمُّ المُسَبِّحات : سورۃ الحدید
(۱۰)

نحمدہٗ ونصلی علٰی رسولہ الکریم ...... امّا بعد:

اعوذ باللّٰہ من الشّیطٰن الرّجیم ۔ بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

﴿ یُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰی وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِیُّ حَتّٰی جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۞ فَالْیَوْمَ لَا یُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْیَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ؕ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ ؕ هِیَ مَوْلٰىكُمْ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ۞ اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا یَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَیْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَكَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۞ اِعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ قَدْ بَیَّنَّا لَكُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۞ اِنَّ الْمُصَّدِّقِیْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِیْمٌ ۞﴾ (آیات ۱۴ تا ۱۸)

اس وقت سورۃ الحدید کا تیسرا حصہ ہمارے زیر مطالعہ ہے۔ ماقبل درس میں ہم آیت ۱۴ پر غور کر رہے تھے جس میں نفاق کے مختلف باطنی مراحل کا ذکر ہوا ہے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ انسان ایک دم پکا منافق نہیں ہو جاتا' بلکہ اس بیماری میں درجہ بدرجہ مبتلا ہوتا ہے۔ جیسا کہ سورۃ المنافقون میں ذکر ہوا: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ

كَـفَـرُوْا ﴾ ''یہ اس لئے ہوا کہ وہ ایمان لائے' پھر انہوں نے کفر کیا''۔ اور اس آیت میں درحقیقت نفاق کی باطنی تشریح ہے اور میدانِ حشر کے ایک مرحلے کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ فرمایا: ﴿ یُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ﴾ ''وہ (منافقین) انہیں (اہل ایمان کو) پکار کر کہیں گے: کیا ہم (دنیا میں) تمہارے ساتھ نہ تھے؟'' ﴿ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴾ ''(جواب میں) اہل ایمان کہیں گے کہ کیوں نہیں' لیکن تم نے اپنے آپ کو (اپنے ہاتھوں) فتنے میں ڈالا اور تم گومگو کی کیفیت میں مبتلا ہو گئے اور تم شکوک و شبہات میں پڑ گئے اور جھوٹی آرزوؤں نے تمہیں دھوکے میں ڈالے رکھا' یہاں تک کہ اللہ کا حکم آ گیا اور بہت بڑے دھوکے باز (شیطانِ لعین) نے تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکے میں مبتلا کئے رکھا''۔

یہاں مختلف کیفیات کے مابین حرفِ عطف آیا ہے۔ عطف میں مغائرت تو ہوتی ہے لیکن لازمی نہیں ہوتا کہ اس میں زمانی ترتیب بھی ہو۔ البتہ اس آیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ترتیبِ زمانی بھی ہے' اور وہ اس طرح کہ ایک چیز کے نتیجے میں دوسری چیز واقع ہو رہی ہے' دوسری چیز کے نتیجے میں تیسری چیز اور پھر تیسری چیز کے نتیجے میں چوتھی چیز واقع ہو رہی ہے۔ ان آیاتِ مبارکہ کی درحقیقت یہی عظمت ہے۔ اسی سورۂ مبارکہ کی آیت ۲۰ میں بھی یہی انداز ہے اور وہ بھی اس سورۂ مبارکہ کی عظیم ترین آیات میں سے ہے۔ یہاں فرمایا گیا: ﴿ وَلٰـكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ ﴾ ''لیکن تم نے اپنے آپ کو (اپنے ہاتھوں) فتنے میں مبتلا کیا''۔ یعنی تم نے علائق دُنیوی اور مال و اسباب دُنیوی سے تعلق جائز حد تک نہیں رکھا' بلکہ اس کو حد سے بڑھنے دیا۔ ﴿ وَتَرَبَّصْتُمْ ﴾ ''اور (اس کے نتیجے میں) تم گومگو کی کیفیت میں مبتلا ہو گئے''۔ تم تردّد اور تذبذب کی کیفیت میں مبتلا ہو گئے۔ ﴿ وَارْتَبْتُمْ ﴾ ''اور (اس تذبذب کے نتیجے میں) تمہارے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا ہو گئے''۔

جیسے یہ ایک حقیقت ہے کہ عمل صالح سے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے اور ایمان سے

عمل صالح میں اضافہ ہوتا ہے بالکل ایسے ہی برائی کا معاملہ ہے کہ ایک برائی کے نتیجے میں ایک اور برائی جنم لیتی ہے اور پھر اس کے نتیجے کے طور پر برائی اور خرابی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ تو یہاں بھی درجہ بدرجہ پسپائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایمان کی جتنی تھوڑی بہت پونجی حاصل تھی اس میں شکوک وشبہات کے کانٹے چبھنے شروع ہو گئے۔ درحقیقت ایمان لانے کے بعد پھر ثابت قدمی کی ضرورت ہوتی ہے۔ سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵ میں ایک مؤمن صادق کی تعریف یوں کی گئی ہے: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا ﴾ ''حقیقی (اور سچے) مؤمن تو صرف وہ ہیں جو اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لائے' پھر شک میں نہیں پڑے''۔ ﴿وَجٰھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ﴾ ''اور انہوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے''۔ ﴿اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴾ ''یہی لوگ ہیں سچے (اپنے دعوائے ایمان میں)''۔

آگے فرمایا: ﴿ وَغَرَّتْکُمُ الْاَمَانِیُّ ﴾ ''اور تمہیں آرزوؤں نے دھوکے میں ڈالے رکھا'' اب ظاہر بات ہے انسان کے اندر ضمیر تو آخر موجود ہے' ایک دم تو ایمان زیرو نہیں ہو جاتا' بلکہ ایمان کی کچھ نہ کچھ رمق تو باقی رہتی ہے۔ تو جب ضمیر ملامت کرتا ہے تو انسان کچھ من گھڑت خیالات اور من گھڑت عقائد قائم کر لیتا ہے۔ اس کی کچھ دلفریب تمنائیں (wishful thinking) ہوتی ہیں کہ اللہ ہمیں بخش ہی دے گا۔ اس لئے کہ ہم تو اللہ سے خصوصی نسبت رکھتے ہیں' اُمت مرحومہ میں ہیں۔ ع ''کچھ بھی ہیں لیکن ترے محبوب کی اُمت میں ہیں!'' ہمارا ایمان کا دعویٰ تو بہر حال اپنی جگہ پر برقرار ہے' لہٰذا ہم تو بخش ہی دیئے جائیں گے۔ تو اس سے ان کا معاملہ مزید پختہ ہوا اور وہ درجہ بدرجہ نفاق میں ترقی کرتے گئے۔ ﴿ حَتّٰی جَآءَ اَمْرُ اللّٰہِ ﴾ ''یہاں تک کہ اللہ کا حکم آ گیا''۔ ﴿وَغَرَّکُمْ بِاللّٰہِ الْغَرُوْرُ ﴾ ''اور بہت بڑے دھوکے باز (شیطانِ لعین) نے تمہیں اللہ کے معاملے میں خوب دھوکہ دیا''۔ اس نے تمہیں اللہ کی شانِ رحیمی اور شانِ غفاری کے حوالے سے دھوکہ دیا۔ بالکل یہی انداز سورۃ الانفطار میں

اختیار کیا گیا ہے کہ تم دراصل اللہ تعالیٰ کی شانِ غفاری اور شانِ رحیمی کا زیادہ حوالہ دے کر اور اس سے دھوکہ کھا کر اللہ کی جزا و سزا کا انکار کر رہے ہو' تم دین کی تکذیب کر رہے ہو' تم نے دراصل اللہ کے جزا و سزا کے قانون کی نفی کر دی ہے۔ یقیناً وہ غفور بھی ہے' وہ رحیم بھی ہے' لیکن وہ شَدِیْدُ الْعِقَابِ (سزا دینے میں سخت) بھی ہے' عَزِیْزٌ ذُوانْتِقَامٍ (انتقام لینے میں سخت) بھی ہے۔ لہٰذا بندۂ مؤمن کا معاملہ اللہ کے ساتھ ''بَیْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَاءِ'' والا رہنا چاہئے کہ اس کی شانِ غفاری سے امید بھی ہو کہ اللہ بخش دے گا' لیکن اس کی سزا کا اندیشہ اور خطرہ بھی رہے۔ اس طرح رویہ متوازن رہے گا۔ اگر ذرا سا بھی رویہ غیر متوازن ہو گیا اور اللہ کی شانِ رحیمی اور شانِ غفاری پر تکیہ زیادہ ہو گیا تو نتیجتاً تم ڈھیلے ہو جاؤ گے' تمہارے اعصاب ڈھیلے پڑ جائیں گے۔ اس لئے کہ پھر آدمی خیال کرتا ہے کہ وہ کاہے کو زیادہ کھکھیڑ مول لے' کاہے کو زیادہ قربانیاں دے' کاہے کو زیادہ مشقتیں جھیلے' کاہے کو پیٹ پر پتھر باندھے' کاہے کو اپنی معاش کے دروازے تنگ کرتا چلا جائے' کاہے کو اپنے لئے دُنیوی ترقی کے راستے مسدود کرے؟ ظاہر بات ہے یہ سب کچھ تو وہی کرے گا جو سمجھے گا کہ مسئولیت لازماً ہونی ہے' ورنہ اللہ کی طرف سے پکڑ اور عذاب کا شدید خطرہ ہے۔

یہ مضمون اتنا اہم ہے کہ سورۂ لقمان اور سورۂ فاطر میں اس پر پوری پوری آیتیں آئی ہیں۔ سورۂ لقمان میں فرمایا گیا ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمْ وَاخْشَوْا یَوْمًا لَّا یَجْزِیْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِہٖ ز وَلَا مَوْلُوْدٌ ھُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِہٖ شَیْئًا ط اِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّکُمُ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا وقف وَلَا یَغُرَّنَّکُمْ بِاللّٰہِ الْغَرُوْرُ﴾ (آیت ۳۳)

''اے لوگو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور ڈرو اس دن سے جس دن کوئی باپ اپنے بیٹے کی طرف سے کوئی بدلہ (فدیہ' کفارہ وغیرہ) نہیں دے سکے گا' اور نہ ہی کوئی بیٹا اپنے باپ کے کسی درجے میں کام آ سکے گا۔ (یاد رکھو!) یقیناً اللہ کا وعدہ حق ہے۔ تو (دیکھنا) تمہیں دنیا کی زندگی دھوکہ نہ دینے پائے' اور (دیکھنا) تمہیں اللہ (کی شانِ رحیمی اور شانِ غفاری) پر دھوکہ نہ دے یہ بڑا

دھوکے باز (شیطانِ لعین)''۔

اس کا خلاصہ سورۂ فاطر میں یوں ذکر ہوا ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّکُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا ۔ وَلَا یَغُرَّنَّکُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ﴾ (آیت۵)

''اے لوگو! اللہ کا وعدہ یقیناً سچا ہے (شدنی ہے' جزا و سزا ہو کر رہے گی)۔ تو (دیکھنا) تمہیں یہ دنیا کی زندگی دھوکے میں نہ ڈال دے اور (دیکھنا) وہ بہت بڑا دغاباز (شیطان لعین) تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکہ نہ دینے پائے''۔

ایک اور جگہ قیامت کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے: ﴿اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِیَةٌ﴾ کہ قیامت لازماً آ کر رہے گی اور حساب و کتاب ہو کر رہے گا۔ اور: ﴿وَاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ﴾ کہ جزا و سزا واقع ہو کر رہیں گے' اس میں کسی طرح کا شک و شبہ نہ پیدا ہونے پائے۔

بہرحال یہ نفاق کے وہ پانچ مدارج ہیں جن میں ایک صاحب ایمان مبتلا ہو سکتا ہے۔ یعنی یہ اُس آدمی کا نفاق نہیں ہے جو دھوکہ دینے کے لئے ہی ایمان لایا ہو' بلکہ یہ ایسا نفاق ہے کہ آدمی ایمان تو لاتا ہے خلوصِ دل سے' لیکن پھر اُس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا' بلکہ بچ بچ کر چلنا چاہتا ہے' جبکہ ایمان تو قربانیاں مانگتا ہے۔ ع ''جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں!'' بچ بچ کر چلنے والوں کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ ع ''مرحلہ سخت ہے اور جان عزیز!'' چنانچہ وہ ایک طرح کی باطنی کشمکش میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ بقول غالبؔ ع ''کعبہ مرے پیچھے ہے' کلیسا مرے آگے!''

منافق کا حسرت ناک انجام

اب اس نفاق کا انجام کیا ہے! فرمایا: ﴿فَالْیَوْمَ لَا یُؤْخَذُ مِنْکُمْ فِدْیَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ؕ﴾ ''تو آج کے دن نہ تم سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا نہ کافروں سے''۔ یہ بہت پیارا انداز ہے۔ یہاں منافقوں کو کافروں کے ساتھ بریکٹ کر دیا گیا ہے۔ اصل میں یہ جواب ہے ان کے اس قول کا کہ: ﴿اَلَمْ نَکُنْ مَّعَکُمْ ؕ﴾ ''کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟'' تو فرمایا جا رہا ہے کہ دنیا میں تم یقیناً اہل ایمان کے ساتھ تھے'

چونکہ تم قانونی طور پر مسلمان تھے لہٰذا ان کے ساتھ شامل رہے' یہاں تک کہ حضور ﷺ کے پیچھے نمازیں پڑھتے تھے۔ لیکن یہاں تم انجام کے اعتبار سے کفار کے ساتھ شامل ہو۔ دراصل یہی نفاق ہے کہ قانوناً تو ایسا شخص دنیا کی زندگی میں مسلمان سمجھا جاتا ہے' جبکہ حقیقتاً' عاقبت اور انجامِ کار کے اعتبار سے وہ کفار کے ساتھ ہے۔ آگے فرمایا جا رہا ہے: ﴿مَاْوٰىكُمُ النَّارُ﴾ "تمہارا ٹھکانہ جہنم ہے"۔ نوٹ کیجئے کہ قرآن مجید میں طنز کا پہلو بھی ہے۔ آوٰی' یُؤْوِیْ' اِیْوَاءً کا مطلب ہے "کسی کو پناہ دینا"۔ اس سے لفظ "مَاْوٰی" بنا ہے جس سے مراد ہے پناہ گاہ' جس کی طرف انسان کسی خطرے سے بچنے کے لئے دوڑتا اور لپکتا ہے۔ طوفان سے بچنے کے لئے اگر کسی نے پہاڑ کے اندر کوئی جگہ تلاش کر لی تو وہ اس کے لئے "ماویٰ" ہے۔ تو فرمایا: ﴿مَاْوٰىكُمُ النَّارُ﴾ کہ اب تمہاری پناہ گاہ یہی آگ ہے۔ ﴿هِيَ مَوْلٰىكُمْ﴾ "یہی تمہاری خبر گیری کرنے والی ہے"۔ یہاں 'مولیٰ' کا لفظ بھی طنزاً استعمال ہوا ہے۔ مولیٰ کا مطلب ہے ہمدرد' غم گسار' مددگار' دوست' پشت پناہ' ساتھی وغیرہ۔ لہٰذا فرمایا: ﴿هِيَ مَوْلٰىكُمْ﴾ کہ یہی آگ تمہاری ہمدرد اور غمگسار ہے' دکھ درد کہنا ہے تو اس سے کہو' نالہ وشیون ہے تو اسی سے کرو۔ مزید فرمایا: ﴿وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝﴾ "اور یہ بہت ہی بری ہے لوٹنے کی جگہ"۔ "مَصِیْر" کا مطلب ہے جانے کی جگہ' وہ جگہ جہاں انسان انجامِ کار پہنچا دیا جائے۔

تاخیر و تعویق = شیطان کا ایک اور وار!

اب یہاں سے سورۃ الحدید کا چوتھا حصہ شروع ہو رہا ہے' جو چار آیات (۱۶ تا ۱۹) پر مشتمل ہے۔ یہ حصہ بھی میرے نزدیک اپنے مضمون کے اعتبار سے قرآن مجید کا نقطۂ عروج ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے یہ جو حقائق درجہ بدرجہ منکشف ہوئے ہیں' اس کے بعد اگر کسی کو اپنے گریبان میں جھانکنا نصیب ہو اور اپنی ایمانی کیفیت اور حقیقت کو دیکھنے اور ٹٹولنے کی توفیق میسر آ جائے (اللہ کرے کہ ایسا ہو!) اور وہ اپنی اصلاح کا ارادہ کر لے تو اس پر بھی شیطان حملہ آور ہوتا ہے۔ اُس وقت شیطان کا حملہ یہ ہوتا ہے کہ وہ انسان کو تاخیر اور تعویق میں مبتلا کر دیتا ہے۔ انسان خیال کرتا ہے کہ ٹھیک ہے

مَیں اپنا رویہ صحیح کرلوں گا‘ لیکن پہلے ذرا یہ کام کرلوں‘ ذرا یہ ذمہ داریاں ادا ہو جائیں‘ ابھی ذرا ملازمت سے ریٹائر ہولوں پھر اپنی اصلاح اور دین کا کام کروں گا۔ یا پھر یہ کہ ذرا بچیوں کے ہاتھ پیلے کرنے ہیں‘ ذرا بچوں کے مستقبل کا معاملہ ہے۔ اسی طرح بچوں کے بعد پھر بچوں کے بچے سامنے آئیں گے اور ان کے مسائل شروع ہو جائیں گے۔ ع ''کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد!'' تو جان لیجئے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد تو انسان کے ہاتھ میں کچھ رہ ہی نہیں جاتا کہ وہ کچھ کر سکے۔ سرکار کھوکھلا کر کے ہی تو چھوڑتی ہے۔ اس وقت تک تمام توانائیاں ختم ہو چکی ہوتی ہیں۔

اس تاخیر وتعویق کی حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے بہترین تاویل کی ہے۔ یہ ان تین صحابہ ﷺ میں سے ایک ہیں جو غزوۂ تبوک میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔ غزوۂ تبوک میں نفیر عام تھی کہ ہر صاحب ایمان اللہ کی راہ میں نکلے‘ تو منافقین نے تو آ کر جھوٹے بہانے بنا کر معذرت کر لی اور اجازت لے لی‘ کچھ بغیر اجازت لئے بھی بیٹھے رہے‘ لیکن جب حضور ﷺ واپس آئے تب وہ قسمیں کھا کھا کر کہنے لگے کہ حضور! میں تو لشکر کے ساتھ جانے کے لئے بالکل تیار تھا‘ مَیں نے تو سواری بھی تیار کی ہوئی تھی‘ لیکن عین وقت پر یہ مصیبت آ گئی کہ میں رک گیا۔ اور حضور ﷺ کی یہ عادتِ ثانیہ تھی کہ ایسے جھوٹوں سے زیادہ اعتناء نہیں فرماتے تھے‘ بس کہہ دیتے کہ جایئے! لیکن یہ تین صحابہ جن میں سے ایک حضرت کعب بن مالکؓ ہیں‘ اگرچہ مؤمنین صادقین میں سے تھے مگر اس لشکر کے ساتھ نہیں جا سکے تھے۔ واپسی پر جب حضور ﷺ کی طرف سے باز پرس ہوئی تو انہوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا۔ حضرت کعب بن مالک ﷺ نے اس موقع پر عرض کیا: حضور! زبان میرے پاس بھی ہے‘ طلاقت لسانی مجھے بھی حاصل ہے‘ میں بھی جھوٹے بہانے بنا کر اس وقت آپؐ کی پکڑ سے اپنے آپ کو بچا سکتا تھا‘ لیکن مَیں صاف اعتراف کرتا ہوں کہ جتنا صحت مند مَیں اِس زمانے میں تھا پہلے اتنا کبھی نہیں رہا‘ اور جتنا غنی مَیں اس زمانے میں تھا اتنا پہلے کبھی نہیں رہا۔ یعنی نہ تو میرے پاس وسائل کی کمی تھی اور نہ میں بیمار تھا۔ بس ہوا صرف یہ کہ میں تاخیر وتعویق میں پڑ گیا۔

میرے نفس نے مجھے یہ دھوکہ دیا کہ رسول اللہ ﷺ تو تیس ہزار کا لشکر لے کر چلیں گے‘ جبکہ تمہاری اونٹنی بڑی صحت منداور تیز رفتار ہے‘ چنانچہ حضور ﷺ کو لشکر لے کر روانہ ہو جانے دو‘ اس کی حرکت قدرے آہستہ ہوگی‘ تم ذرا دو چار دن کے بعد تیزی کے ساتھ منزل پر منزل طے کرتے ہوئے حضور ﷺ کے ساتھ مل جانا۔ تو میں اس دھوکے میں آ گیا اور سوچتا رہا کہ شدید گرمیوں کا موسم ہے اور صحرا کا سفر ہے‘ ذرا گھر میں تھوڑا عرصہ مزید آرام کر لوں اور ٹھنڈی چھاؤں سے لطف اندوز ہولوں۔ (گویا ع ’’تپتی راہیں مجھ کو پکاریں‘ دامن پکڑے چھاؤں گھنیری!‘‘) تو میں اسی طرح ایک ایک دن کر کے ٹالتا رہا۔ ایک دن اچانک مجھے احساس ہوا کہ اب تو چاہے میں کتنی ہی تیز رفتاری سے جاؤں آپؐ کے ساتھ نہیں مل سکتا‘ بس میرے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ حضور ﷺ نے سزا کے طور پر ان کا سماجی مقاطعہ کر دیا کہ کوئی مسلمان ان سے بات تک نہ کرے۔ یہ ان کے لئے بڑی سخت سزا تھی۔ یہ بخاری شریف کی بڑی پیاری حدیث ہے اور طویل ترین احادیث میں سے ایک ہے۔ ہر شخص کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

تو یہ تاخیر و تعویق اصل میں شیطان کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ جیسے اقبال نے کہا:

آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ ”اِنَّ الْمُلُوْکَ“
سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری!

تو یہاں پر اب اس تعویق و تاخیر سے ٹوکا گیا ہے۔ ارشاد ہوا: ﴿اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِکْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ﴾ ’’کیا اہل ایمان کے لئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل جھک جائیں اللہ کے ذکر میں اور اُس (قرآن) کے آگے جو نازل شدہ حق ہے‘‘۔ یہ ایک طرح سے جھنجھوڑنے کا انداز ہے کہ کس امید پر تم یہ تاخیر و تعویق کر رہے ہو؟ تمہیں کل کی زندگی کا بھی یقین ہے کہ تمہیں کل کا سورج دیکھنا نصیب ہوگا؟ جبکہ تمہارے منصوبے تو طول طویل ہیں اور تم سالوں کا حساب بنا رہے ہو

کہ اس کام سے فارغ ہو جاؤں' یہ ذمہ داریاں ادا کرلوں' یہ معاملہ طے ہو جائے تو پھر میں دین کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دوں گا۔ لیکن قرآن پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ: ﴿اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ﴾ ''کیا وقت آ نہیں گیا ہے اہل ایمان کے لئے کہ جھک جائیں ان کے دل اللہ کے ذکر سے اور اُس کے سامنے جو نازل ہوا حق میں سے''۔ خَشَعَ' یَخْشَعُ کا مطلب ہے جھک جانا۔ ایک آیۂ کریمہ میں میدانِ حشر کا ایک نقشہ یوں کھینچا گیا ہے: ﴿خَاشِعَۃً اَبْصَارُھُمْ تَرْھَقُھُمْ ذِلَّۃٌ﴾ ''(قیامت کے دن میدانِ حشر میں) ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی اور ذلت اُن پر چڑھی آ رہی ہوگی''۔ یعنی تباہی و بربادی کو اپنے سامنے دیکھ کر شرمندگی سے کافروں کی نگاہیں نیچے زمین میں گڑی ہوں گی اور انہیں نہایت شرمناک سلوک کا سامنا ہوگا۔ تو اہل ایمان کو جھنجھوڑا جا رہا ہے کہ اب بھی تم تاخیر و تعویق میں پڑے ہوئے ہو؟ کیا وہ وقت آ نہیں گیا ہے کہ تم جھک جاؤ اللہ کی یاد کے آگے اور اس حق کے سامنے جو اللہ کی طرف سے نازل ہو چکا ہے۔ اس حق نے جہاں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی جدا کر دیا ہے' حق و باطل کو ممیّز کر دیا ہے' تمہیں اندھیروں سے نکال کر روشنی میں آنا نصیب فرما دیا ہے' اسی حق نے تمہیں کچھ ذمہ داریاں بھی سونپی ہیں' اسی کلامِ الٰہی نے تمہارے فرائض بھی معین کئے ہیں' اس نے تمہیں یہ بتا دیا ہے کہ دین تم سے کیا چاہتا ہے' دین کا تقاضا کیا ہے۔ تمہارے فرائض کیا ہیں۔ تو کب تک تم اس تاخیر اور تعویق میں پڑے رہو گے؟

اہل کتاب کا عبرت آموز تذکرہ

آگے فرمایا: ﴿وَلَا یَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلُ﴾ ''اور نہ ہو جائیں وہ ان لوگوں کے مانند جن کو کتاب دی گئی تھی پہلے''۔ اِن سورتوں (المُسبحات) میں اہل کتاب کا تذکرہ بطورِ نشانِ عبرت ہے کہ مسلمانو! تم سے پہلے بھی ایک اُمت مسلمہ (بنی اسرائیل) تھی' جسے اب معزول کر دیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ قرآن میں جیسے الفاظ سابقہ اُمت مسلمہ کے لئے آئے ہیں ہمارے لئے نہیں

آ ئے۔اُن سے فرمایا گیا تھا: ﴿وَاَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ﴾ ''اور یہ کہ میں نے تمہیں تمام جہان والوں پر فضیلت عطا کی''۔ ذرا ان الفاظ کی گھمبیرتا کا تصور کیجئے! ٹھیک ہے ہمیں بھی دو مرتبہ خیر اُمت اور اُمت وسط کہا گیا ہے' لیکن ان کے لئے فضیلت اور برتری کے جو الفاظ آئے ہیں وہ ہمارے لئے نہیں آئے۔ ان میں تو چودہ سو برس تک نبوت کا تار ٹوٹا ہی نہیں۔ ان میں سلسلۂ نبوت ورسالت شروع بھی ہوا تو دو نبیوں حضرات موسیٰ اور ہارون علیہما السلام سے اور پھر چودہ سو برس کے بعد اس سلسلۂ انبیاء کا خاتمہ ہوا تو بھی دو نبیوں حضرات عیسیٰ اور یحییٰ علیہما السلام پر۔ ان کو کتابیں بھی تین دی گئیں۔ صحیفے تو بے شمار دیئے گئے' کیونکہ بے شمار نبی مبعوث ہوئے اور ہر ایک پر وحی آتی رہی' اور یہ انہی انبیاء کی کتابیں ہیں جو ''Old Testament'' میں جمع ہیں۔ قرآن مجید میں بھی ان کے لئے تین کتابوں تورات' زبور اور انجیل کا تذکرہ ہے۔ لیکن وہی قوم اب نشانِ عبرت ہے۔ اسی قوم کے لئے فرمادیا گیا کہ: ﴿ضُرِبَتۡ عَلَیۡہِمُ الذِّلَّۃُ وَالۡمَسۡکَنَۃُ وَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ ﴾ ''ان پر (اللہ کی طرف سے) ذلت اور مسکنت مسلط ہوگئی اور وہ اللہ کے غضب (عذاب) میں گھر گئے''۔ انہی پر اللہ کے عذاب کے کوڑے برسے ہیں۔ انہیں بخت نصر کے ہاتھوں تباہ و برباد کیا گیا۔ پھر کبھی رومیوں کے ہاتھوں ان کی پٹائی ہوئی اور کبھی یونانیوں کے ہاتھوں' یہاں تک کہ پچھلی صدی میں دوسری عالمگیر جنگ کے دوران ہٹلر کے ہاتھوں ان کے ساتھ جو عبرت ناک سلوک ہوا اس کی مثال تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ اس دوران ساٹھ لاکھ یہودی قتل ہوئے ہیں۔ بخت نصر کی بات تو خیر اڑھائی ہزار سال پرانی ہوگئی ہے' لیکن یہ تو ماضی قریب کا واقعہ ہے۔ حالانکہ ان یہودیوں کا یہ قول رہا ہے: ﴿نَحۡنُ اَبۡنٰٓؤُا اللّٰہِ وَاَحِبَّآؤُہٗ ﴾ ''ہم تو اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں''۔ ان کے اس ادّعا پر قرآن کا تبصرہ یہ ہے: ﴿فَلِمَ یُعَذِّبُکُمۡ بِذُنُوۡبِکُمۡ ﴾ ''تو وہ تمہیں سزا کیوں دیتا ہے تمہارے گناہوں کی پاداش میں؟'' تم اگر اپنے خیال میں اللہ کے ایسے ہی لاڈلے اور چہیتے ہو تو اللہ تمہیں تمہارے گناہوں کی پاداش میں عذاب کیوں دیتا رہا ہے؟ اس نے دنیا میں

تمہیں بری طرح پٹوایا ہے تو آخرت میں بھی تم پر عذاب کے کوڑے برسیں گے۔

ان تمام حوالوں سے مسلمانوں کو عبرت دلائی جارہی ہے کہ دیکھو مسلمانو! کہیں تم بھی ان کے مانند نہ ہوجانا! چنانچہ فرمایا جارہا ہے: ﴿وَلَا یَكُونُوا كَالَّذِینَ اُوتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَیْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ﴾ ''اور وہ نہ ہوجائیں ان لوگوں کی مانند جن کو پہلے کتاب دی گئی تھی، تو اُن پر جب ایک مدت مدید گزر گئی تو اُن کے دل سخت ہوگئے''۔

تاخیر وتعویق کا نتیجہ: قساوتِ قلبی

نوٹ کیجئے کہ ایک تو صرف شدتِ تاثر کے لئے قساوتِ قلبی کا لفظ استعمال ہوجاتا ہے۔ جیسا کہ روایات میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ بھی مذکور ہے۔ جب آپؓ کے پاس اہل یمامہ کا ایک وفد آیا اور ان کے سامنے قرآن پڑھا گیا تو ان لوگوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے تو اس موقع پر خلیفۃ المسلمین حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''هٰكَذَا كُنَّا حَتّٰى قَسَتِ الْقُلُوْبُ '' کہ یہی حال کبھی ہمارا بھی ہوتا تھا، یہاں تک کہ ہمارے دل سخت ہوگئے۔ لیکن یہ صرف شدتِ تاثر ہے۔ جیسے حضور ﷺ فرمایا کرتے تھے: ((اِنَّهٗ لَیُغَانُ عَلٰی قَلْبِیْ)) ''بے شک میرے دل پر بھی کبھی کوئی حجاب سا طاری ہوجاتا ہے''۔ اس سے کہیں آپ لفظی اشتراک کی وجہ سے دھوکہ نہ کھاجائیں کہ ہمارے دلوں کے حجاب اور حضور ﷺ کے دل کے حجاب کی نوعیت کوئی ایک جیسی ہوسکتی ہے۔ (نعوذ باللہ) ع چہ نسبت خاک را با عالم پاک!

اسی قساوتِ قلبی کے بارے میں سورۃ البقرۃ کی آیت ۷۴ ہے:

﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِیَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا یَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا یَشَّقَّقُ فَیَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا یَهْبِطُ مِنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ۝﴾

''پھر (ایسی نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی) تمہارے دل سخت ہوگئے، پتھروں کی طرح سخت، بلکہ سختی میں ان سے بھی کچھ بڑھے ہوئے، کیونکہ پتھروں میں سے تو

کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جس میں سے چشمے پھوٹ بہتے ہیں' اور ان میں سے کوئی ایسا بھی ہوتا ہے کہ پھٹتا ہے تو اس میں سے پانی نکلتا ہے' اور کوئی خدا کے خوف سے لرز کر گر بھی پڑتا ہے۔ اور اللہ تمہارے کرتوتوں سے بے خبر نہیں ہے''۔

اس آیت کا حوالہ قساوتِ قلوب کے ضمن میں بہت ضروری ہے۔ اس آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جب انسان کا دل سخت ہوتا ہے تو پھر کسی چٹان اور پتھر کی سختی بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اور یہ تو ہمارے عام مشاہدے کی بات ہے کہ کوئی بھیڑیا بھی ایسی درندگی نہیں کر سکتا جو انسان انسان کے ساتھ کرتا ہے۔ کوئی درندہ جب بھوکا ہو تو وہ ضرور اپنی درندگی کا مظاہرہ کرتا ہے' لیکن آج انسان قومیت پرستی کے بھوت میں اندھا ہو کر درندگی کا جو مظاہرہ کر رہا ہے وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ آج بوسنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے' تقسیمِ ہند کے وقت مشرقی پنجاب میں جو کچھ ہوا تھا' کبھی مشرقی پاکستان میں جو کچھ ہوا تھا اسے کون بھلا سکتا ہے! افسوس کہ مسلمانوں کے ہاتھوں بھی یہ ظلم وستم ہوا ہے۔ کراچی میں مسلمانوں نے مسلمانوں کے ساتھ ظلم وستم کی جو داستانیں رقم کی ہیں وہ کوئی درندہ بھی نہیں کر سکتا۔ گھروں میں آگ لگائی گئی ہے اور پھر بچوں کو اٹھا اٹھا کر اُس میں پھینکا گیا ہے۔ تو ایسی قساوتِ قلبی کسی درندے کے اندر بھی نہیں ہوگی۔ انسان جب گرتا ہے تو اسفل سافلین میں ہو جاتا ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۞ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ ۞﴾ ''ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا' پھر اسے الٹا پھیر کر ہم نے سب نیچوں سے نیچ کر دیا''۔ تو انسان جب گرتا ہے تو پھر نیچوں میں بھی سب سے نیچے چلا جاتا ہے۔ تو فرمایا کہ اس تاخیر وتعویق کے باعث تمہارے دل سخت ہوتے چلے گئے اور سختی میں پتھروں کے مانند ہو گئے' بلکہ ان سے بھی زیادہ سخت۔ اس لئے کہ پتھروں میں تو ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان میں سے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں۔ اور ایسے پتھر بھی ہیں جو شق ہو جاتے ہیں تو ان میں سے پانی نکل آتا ہے۔ بڑی بڑی چٹانیں اللہ کے خوف سے منہدم ہو جاتی ہیں' اللہ کے سامنے سرنگوں ہو جاتی ہیں۔ اور تمہارے یہ کرتوت اللہ سے ڈھکے چھپے ہرگز نہیں ہیں۔ درحقیقت یہ قساوتِ قلبی اور فسق وفجور اسی تعویق وتاخیر کا نتیجہ ہے۔

اس آیت میں یہودیوں کی طرف صرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کیونکہ اُس وقت یہود کی سیرت وکرداراوران کے تمام معاملات مسلمانوں کے سامنے تھے اس لئے ان کی طرف صرف اشارہ کردینا کافی تھا

اُمید کی روشن کرن

اس ترہیب اور ڈانٹ ڈپٹ کے بعد اب اگلی آیت میں تشویق وترغیب اور حوصلہ افزائی کا انداز ہے۔ کسی بھی قسم کی تربیت وتعلیم کے لئے یہ دونوں چیزیں لازم ہیں۔ یعنی ڈانٹ ڈپٹ' زجر وتنبیہہ اور تہدید بھی ضروری ہے' لیکن پھر ساتھ ہی تھپکی بھی دی جانی چاہئے' حوصلہ بھی بڑھایا جانا چاہئے کہ گھبراؤ نہیں' اگر واقعتاً تمہیں محسوس ہو جائے کہ دل سخت ہو گئے ہیں' دلوں کے اندر ایمان کے بجائے ویرانی ہے' ہم کسی مغالطے میں ہیں کہ ہم مؤمن ہیں' تو یہ احساس بھی بہت قیمتی ہے' اس کو بھی بڑی مضبوطی کے ساتھ تھامو! کہیں یہ لحہ بھی نہ جاتا رہے۔ اپنے اندر سے تمہارا نفس یا شیطانِ لعین تمہیں کوئی تھپکی دے کر سلا نہ دے۔ لہٰذا فرمایا: ﴿ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ ﴾ ''جان لو! اللہ تعالیٰ زمین کو اس کے مُردہ ہونے کے بعد دوبارہ زندہ کردیتا ہے''۔ تمہارے دلوں کی زمین اگر ویران ہوگئی ہے' اگر تم محسوس کرتے ہو کہ نورِ ایمان سے خانۂ دل خالی ہو گیا ہے تو بھی گھبراؤ نہیں' مایوس نہ ہو۔ ﴿لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ﴾ ''اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جانا''۔ اللہ تعالیٰ زمین کو اس کی موت کے بعد دوبارہ زندہ کر دیتا ہے۔ بے آب وگیاہ زمین پر' جہاں زندگی کے آثار نہ ہوں' ویرانی ہی ویرانی ہو' بارش برستی ہے تو وہیں پر سبزہ اگ آتا ہے۔ ؏ ''مگر اب زندگی ہی زندگی ہے موجزن ساقی۔''(۱)

---

(۱) جگر مراد آبادی نے جب پینے پلانے سے توبہ کر لی تھی تو انہوں نے ایک ساقی نامہ کہا تھا۔ اس میں ایک شعر ہے:

رگوں میں بھی کبھی صہبا ہی صہبا رقص کرتی تھی
مگر اب زندگی ہی زندگی ہے موجزن ساقی!

یعنی کبھی ہماری رگوں کے اندر شراب گردش کرتی تھی' مگر اب زندگی گردش کر رہی ہے ۔

آپ کو معلوم ہے کہ جہاں ہر طرف ویرانہ ہی ویرانہ ہو اور موت کا سماں ہو تو کوئی پرندہ بھی وہاں نہیں جاتا۔ وہ کاہے کو وہاں جا کر چہچہائے؟ کون ہے اس کی آواز سننے والا؟ لیکن جب اسی جگہ پر بارش برستی ہے تو ہریالی ہی ہریالی ہوتی ہے۔ اب پرندے بھی وہاں ڈیرے ڈال لیتے ہیں' حشرات الارض بھی رینگتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ ساری حیات کہاں سے آ گئی؟ تو اگر اللہ تعالیٰ مُردہ زمین کو زندہ کر دیتا ہے تو پھر تمہارے لئے بھی مایوس ہونے کی بات نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ جیسے مُردہ زمین کو دوبارہ زندہ کر دیتا ہے اسی طرح وہ تمہارے دلوں کی مُردہ زمین کو بھی حیاتِ تازہ عطا کر دے گا اور ایمان کے نور سے منور کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ایمان کی لہلہاتی ہوئی فصل تمہاری اسی کشتِ قلوب کے اندر پیدا ہو جائے گی۔ آگے اس کے لئے راہنمائی بھی کی جا رہی ہے کہ: ﴿قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۞﴾ ''ہم نے (اپنی) آیات تمہارے لئے واضح کر دی ہیں تا کہ تم عقل سے کام لو''۔ تا کہ تم اس سے سبق حاصل کرو۔ مایوس ہونے کی بات نہیں ہے' تم اپنی اصلاح کے لئے کمر ہمت کس لو۔

سلوکِ قرآنی کی پہلی منزل

اب اگلی آیت سلوکِ قرآنی سے متعلق ہے۔ یعنی جب دلی کیفیت کا ادراک ہو جائے اور آدمی اپنے باطن میں جھانک کر محسوس کرے کہ دل نورِ ایمان سے خالی ہے تو بھی مایوس نہ ہو' اسی زمین میں ایمان کی فصل لہلہا سکتی ہے۔ لیکن اس کے لئے ہل چلانا ضروری ہے۔ وہ ہل کون سا ہے؟ فرمایا: ﴿اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ۞﴾ ''یقیناً صدقہ دینے والے مَرد اور صدقہ دینے والی عورتیں' اور جو قرض دیں اللہ کو قرضِ حسنہ' اُن کو یقیناً کئی گنا بڑھا کر دیا جائے گا اور ان کے لئے بڑا باعزت اجر ہے''۔ ہم اسی سورۃ میں وہ آیت بھی پڑھ چکے ہیں کہ: ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ ''کون ہے جو اللہ کو قرض دے قرضِ حسنہ؟'' سورۃ التغابن میں بھی یہی بات ارشاد فرمائی گئی: ﴿اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ۞﴾ ''اگر

تم اللہ کو قرضِ حسنہ دو تو وہ تمہیں کئی گنا بڑھا کر دے گا اور تمہارے قصوروں سے درگزر فرمائے گا۔ اور اللہ بڑا قدردان اور بردبار ہے''۔

اس آیت کا ایک تو فلسفہ سمجھ لینا چاہئے۔ دیکھئے دنیا کی محبت دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک علائق دُنیوی کی محبت اور ایک مال و اسبابِ دُنیوی کی محبت۔ ان دونوں کو یکجا کریں گے تو دنیا کی محبت میں سب سے زیادہ علامتی حیثیت جس چیز کو حاصل ہے وہ مال کی محبت ہے۔ اس لئے کہ مال سے ہی دنیا ہے۔ مال سے دنیا کی بڑی سے بڑی نعمت اور بڑی سے بڑی آسائش حاصل کی جاسکتی ہے۔ تو اصل میں مال کی محبت ہے جو قربِ الٰہی کے راستے کی رکاوٹ بنتی ہے اور یہ گویا بریک کا کام کرتی ہے۔ جب تک یہ بریک نہ کھلے گاڑی نہیں چلتی' چاہے آپ ایکسیلیٹر دباتے رہیں۔ سورۂ آل عمران میں فرمایا گیا ہے: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ ''تم نیکی تک ہرگز رسائی حاصل نہیں کر سکتے جب تک کہ خرچ نہ کرو وہ چیز جو تمہیں محبوب ہے''۔ یعنی وہ چیز نہیں جو دل سے اُتر چکی ہو' بلکہ محبوب شے اللہ کے راستے میں خرچ کرو۔ عربی زبان میں ''لَنْ'' کے ساتھ جو نفی آتی ہے اِس سے زیادہ تاکید ممکن نہیں ہے۔ تو فرمایا جا رہا ہے: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ﴾ ''تم ہرگز رسائی حاصل نہیں کر سکتے نیکی تک''۔ یعنی بخل اور نیکی ساتھ ساتھ ہوں' یہ ناممکن ہے۔ آپ زاہد ہو جائیں گے' عابد ہو جائیں گے' لیکن جب تک بخل کا بریک لگا ہوا ہے آپ نیک نہیں ہو سکتے۔ اللہ کے نزدیک نیکی اور شے ہے۔ اسی طرح آپ محدث ہو سکتے ہیں' مفتی ہو سکتے ہیں' مفسر ہو سکتے ہیں' بڑے عالم ہو سکتے ہیں' لیکن نیک نہیں ہو سکتے اگر یہ بریک لگی ہوئی ہے۔ لہٰذا اس بات کو ذہن میں رکھئے کہ دل سے مال کی محبت کو نکالنا ہوگا۔ یہ سلوکِ قرآنی کی شرطِ اوّل ہے' یہ ہل تو چلانا ہی پڑے گا۔

اسی کی درحقیقت وضاحت ہے جو سورۃ البلد میں ہے۔ اللہ تعالیٰ بڑے شکوے کے انداز میں گلہ کر رہے ہیں کہ ہم نے انسان کو کیا کیا نعمتیں دیں! ﴿اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۝ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ ۝ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۝﴾ ''کیا ہم نے اسے (انسان کو)

دو آنکھیں' اور ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں دیئے؟ اور (نیکی اور بدی کے) دونوں نمایاں راستے اسے (نہیں) دکھا دیئے؟'' آگے فرمایا: ﴿فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ﴾ ''پس یہ گھاٹی کو عبور نہیں کر سکا''۔ ہم نے اسے کیسی کیسی نعمتیں دی ہیں' مگر یہ کم ہمت' تھڑ دلا دشوار گزار گھاٹی سے گزرنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ تو یہ ایک طرح کی گھاٹی ہے جسے میں بریک کہہ رہا ہوں۔ اس گھاٹی سے نکل جائیں گے تو آگے راستہ کھلا ہے' لیکن گھاٹی اوکھی ہے۔ پنجابی شاعر عبداللہ شاکر کے بقول ع ''اوکھی گھاٹی مشکل پینڈا عشق دیاں اسواراں دا!'' تو اس اوکھی گھاٹی کو عبور کرنا مشکل ہے۔ آگے ارشاد فرمایا: ﴿وَمَا اَدْرٰکَ مَا الْعَقَبَةُ ﴾ ''اور تم کیا جانو کہ وہ گھاٹی کیا ہے''۔ ﴿فَکُّ رَقَبَةٍ ﴾ ''کسی (غلام کی) گردن کو غلامی سے آزاد کرا دینا ہے''۔ ﴿اَوْ اِطْعَامٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ ﴿ یَتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ﴿ اَوْ مِسْکِیْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ﴾ ''یا کھانا کھلانا کسی قرابت دار یتیم یا خاک نشین مسکین کو (جو مٹی میں مل رہا ہے) فاقے کے دن''۔ یعنی قحط کے دن کسی یتیم یا فاقہ کش مسکین کو کھانا کھلانا جب اپنے بھی لالے پڑ رہے ہوں۔ اگر اپنے گودام اناج سے بھرے ہوئے ہیں تب آپ نے لنگر کھول دیا تو یہ اور بات ہے' لیکن جب اپنے بھی لالے پڑے ہوئے ہوں تب کسی بھوکے کو کھانا کھلانا' یہ ہے دراصل مشکل گھاٹی۔ اس گھاٹی کو اگر عبور کر لیا تو کامیابی ہے۔ یہ بہت اہم مقام ہے اور بہت کم لوگوں نے اس کا گہرائی میں جا کر مطالعہ کیا ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہے: ﴿ثُمَّ کَانَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ﴾ ''پھر (اس کے بعد یہ کہ) آدمی ان لوگوں میں شامل ہو جو ایمان لائے اور جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر اور (خلقِ خدا پر) رحم کی تلقین کی''۔ یعنی اس گھاٹی میں سے گزر کر جو ایمان لایا ہے دراصل وہ ہے کہ جس کے لئے آگے راستے کھلے پڑے ہیں۔ دیکھئے ایک ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں جو اِس حال میں ایمان لائے ہیں کہ وہ مال کی محبت سے پہلے سے بری ہیں۔ جبکہ ایک شخص وہ ہے جو دل میں مال کی محبت لئے ہوئے ایمان لایا ہے۔ لہٰذا جب تک وہ اپنے دل کو مال کی محبت سے' جو کہ نجاست ہے' پاک نہیں کرے گا تو سوائے نفاق کے

اس کے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔

''انفاق فی سبیل اللہ'' اور ''صدقات'' میں فرق کی نوعیت!

ہمارے اس سلسلۂ درس میں اب تک ایک تو ''انفاق فی سبیل اللہ'' کی اصطلاح آئی ہے: ﴿وَمَا لَكُمْ اَنْ لَّا تُنْفِقُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ یعنی اللہ کے راستے میں خرچ کرنا۔ دوسری اصطلاح آئی ہے اللہ کو قرضِ حسنہ دینا۔ ﴿مَنْ ذَا الَّذِىْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ اور ﴿وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ جبکہ اب ایک اصطلاح ''صدقات'' کی آئی ہے۔ صدقہ کس کو کہتے ہیں؟ ہم عام طور پر جو صدقے کا لفظ استعمال کرتے ہیں وہ کسی اچھے معنوں میں نہیں ہوتا۔ جبکہ صدقہ اصل میں صدق سے بنا ہے۔ دراصل یہ انسانیت کی صداقت کا ثبوت ہے کہ آپ کسی انسان کو بھوکا دیکھیں تو اسے کھانے میں شریک کریں، اسے کسی تکلیف میں دیکھیں تو اگر آپ اس کی تکلیف کا ازالہ کر سکتے ہوں تو اُدھر متوجہ ہو جائیں اور اس کی تکلیف رفع کریں۔ اگر کسی میں یہ رأفت اور رحمت نہیں ہے تو وہ پھر حقیقی انسان ہی نہیں ہے۔ اسی لئے حضور ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ يُحْرَمِ الرِّفْقَ فَقَدْ حُرِمَ الْخَيْرَ كُلَّهٗ)) ''جو شخص دل کی نرمی سے محروم ہو گیا وہ گویا کل کے کل خیر سے محروم ہے''۔ اس کے پاس خیر کہاں سے آئے گا! کسی کٹھور دل اور سنگدل انسان کے پاس خیر آ ہی نہیں سکتا۔ چاہے کوئی شخص اپنے اوپر تقویٰ اور دینداری کے لاکھ لبادے اوڑھ لے، مسجدوں کو قالین بھی فراہم کر دے اور بڑے بڑے چندے بھی دے، لیکن جب تک وہ دل کی نرمی سے محروم ہے وہ کُل کے کُل خیر سے محروم ہے۔

لہٰذا اب مال خرچ کرنے کی دو اقسام سامنے آئی ہیں جنہیں الگ الگ شناخت کرنا ضروری ہے۔ ایک ہے ابنائے نوع کی دادرسی میں اور ان کی تکلیف دور کرنے میں مال خرچ کرنا۔ یعنی فقراء، مساکین، بیواؤں، یتیموں اور مقروضوں وغیرہ کے لئے مال خرچ کرنا۔ یہ ''صدقہ'' ہے۔ زکوٰۃ کا بڑا مصرف بھی یہی ہے۔ اگرچہ زکوٰۃ کے مصارف میں ''فی سبیل اللہ'' بھی ہے لیکن وہ آٹھ مدات میں سے ایک ہے۔ اسی لئے زکوٰۃ کے

مصارف پر سورۃ التوبۃ میں جو آیت آئی ہے اس میں لفظ ''زکوٰۃ'' آیا ہی نہیں' ''صدقات'' آیا ہے۔ فرمایا: ﴿اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰکِیْنِ...... الخ﴾ تو صدقہ اور زکوٰۃ کو ایک طرف کر لیجئے۔ جبکہ ایک ہے اللہ کی حکومت قائم کرنے کے لئے' اللہ کے پیغام کو عام کرنے کے لئے' اللہ کے دین کی جدوجہد کے لئے ساز و سامان فراہم کرنے کے لئے مال خرچ کرنا۔ یہ ہے ''انفاق فی سبیل اللہ'' اور یہی ہے اللہ کے لئے قرضِ حسنہ۔ اس لئے کہ یہ تو اللہ کا ذاتی معاملہ ہے۔ سورۃ الحدید ہی میں آگے جا کر یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿وَلِیَعْلَمَ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ وَرُسُلَہٗ بِالْغَیْبِ﴾ ''اور تا کہ اللہ جان لے (ظاہر کر دے) کہ کون ہے جو مدد کرتا ہے اس کی اور اس کے رسولوں کی غیب میں رہتے ہوئے''۔ چنانچہ ایسے لوگوں کو اللہ اپنا مددگار قرار دیتا ہے جو اُس کی حکومت قائم کرنے کے لئے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر حاضر ہو جاتے ہیں۔

ذرا غور کیجئے' ہندوستان میں شیعیت کب آئی ہے! ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہونے کے پورے تین سو برس بعد تک شیعیت کا نام ونشان نہیں تھا۔ یہ خالص سنی مسلمان ملک تھا۔ لیکن جب شیر شاہ سوری نے ہمایوں کو شکست دی اور اسے بھاگنے پر مجبور کر دیا تو اب وہ ایران گیا اور وہاں شہنشاہ طہماسپ سے فوج لے کر آیا۔ یہ جو قزلباش کہلاتے ہیں یہ اس وقت ایران سے آئے تھے اور ان کے ساتھ ہی شیعیت آئی ہے۔ اب ظاہر بات ہے وہ تو ہمایوں کے مددگار اور محسن تھے جنہوں نے اسے دوبارہ تختِ دہلی لے کر دیا' جنہوں نے حکومت ہند اسے دوبارہ دلوائی تو ان سے بڑا محسن کون ہوگا! یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد سے مغلیہ دربار پر اہل تشیع کو غلبہ حاصل ہوا اور ہندوستان کے اندر شیعیت پھیلتی چلی گئی۔ اب آپ اسی کے اوپر قیاس کیجئے! اس وقت دنیا میں اللہ کی حکومت کے خلاف بغاوت ہے۔ اگر آپ اللہ کے وفادار بن کر دنیا میں اس کی حکومت قائم کرنے کے لئے اپنا تن' من' دھن لگا رہے ہیں تو آپ لازماً اللہ کے مددگار ہوئے۔ اس سورۂ مبارکہ کی مرکزی اور عظیم ترین آیت انہی الفاظ پر ختم ہو رہی ہے: ﴿وَلِیَعْلَمَ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ وَرُسُلَہٗ بِالْغَیْبِ﴾ ''اللہ دیکھنا چاہتا ہے کون ہیں

(اس کے وفادار بندے) جو غیب میں ہونے کے باوجود اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں''۔ سورۃ الصّف کی آخری آیت کا مضمون بھی یہی ہے: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰہِ کَمَا قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ﴾ ''اے ایمان والو! اللہ کے مددگار بنو! جیسے عیسیٰ ابن مریم نے حواریوں سے کہا تھا کہ کون میرا مددگار ہے اللہ کی طرف؟'' تو اللہ کے راستے میں جان و مال کھپانے والے اللہ کے بھی مددگار ہیں اور رسول کے بھی مددگار ہیں۔

خرچ کی ان دو مدوں کی علیحدہ علیحدہ شناخت کرنا ضروری ہے۔ ایک ہے غرباء' مساکین' یتیموں' بیوائیوں' مقروضوں' غلاموں اور دیگر محتاجوں کی مدد کے لئے' ان کی احتیاج اور تکلیف کو دور کرنے کے لئے خرچ کرنا۔ یہ ہے صدقہ اور خیرات' اور ایک ہے انفاق فی سبیل اللہ یا اللہ کو قرضِ حسنہ دینا۔ اس آیت میں ان دونوں کو جمع کیا گیا: ﴿اِنَّ الْمُصَّدِّقِیْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ﴾ ''یقیناً صدقہ کرنے والے مرد اور صدقہ کرنے والی عورتیں۔'' ﴿وَاَقْرَضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ ''اور جنہوں نے اللہ کو قرضِ حسنہ دیا ہے''۔ اب یہاں پر ''وَالَّذِیْنَ'' محذوف ماننا پڑے گا کہ ''وَالَّذِیْنَ اَقْرَضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا''۔ اس لئے کہ اسم پر فعل کا عطف براہ راست نہیں آتا۔ ''اور وہ لوگ کہ جو اللہ کو قرضِ حسنہ دیں''۔ یعنی اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے' اقامت دین کے لئے' غلبۂ دین حق کے لئے' حکومتِ الٰہیہ کے قیام کے لئے' نظامِ خلافت کو برپا کرنے کے لئے۔ آگے فرمایا: ﴿یُضٰعَفُ لَھُمْ وَلَھُمْ اَجْرٌ کَرِیْمٌ ۞﴾ ''ان کے لئے دوگنا کیا جائے گا (اجر) اور ان کے لئے بڑا باعزت اجر ہے''۔ اللہ کو قرض حسنہ دینے کا مطالبہ اس سورۃ میں پہلے بھی بایں الفاظ آیا ہے: ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗٓ اَجْرٌ کَرِیْمٌ ۞﴾ (آیت ۱۱) اور سورۃ التغابن میں بھی یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعِفْهُ لَکُمْ وَیَغْفِرْ لَکُمْ وَاللّٰہُ شَکُوْرٌ حَلِیْمٌ ۞﴾ (آیت ۱۷) کم وبیش وہی الفاظ یہاں ہیں کہ ﴿یُضٰعَفُ لَھُمْ وَلَھُمْ اَجْرٌ کَرِیْمٌ ۞﴾ کہ ان کے لئے اجر میں بڑھوتری ہوتی رہے گی' اضافہ ہوتا رہے گا' اور

اضافی طور پر جو اجر کریم دیا جائے گا وہ اس پر مستزاد ہے۔تمہارا اصل مال تو تمہیں بہت بڑھا ہوا ملے گا ہی' مزید اللہ کی طرف سے بہت باعزت بدلہ' بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ ملے گا۔

اللھم وفقنا لھذا ۔ اللھم طھر قلوبنا من النفاق واعمالنا من الریاء والسنتنا من الکذب واعیننا من الخیانۃ فانک تعلم خائنۃ الاعین وما تخفی الصدور ...... آمین یارب العٰلمین OO

کیا آپ جاننا چاہتے ہیں کہ

- از روئے قرآن حکیم ہمارا دین کیا ہے؟
- ہماری دینی ذمہ داریاں کون کون سی ہیں؟
- نیکی' تقویٰ اور جہاد کی اصل حقیقت کیا ہے؟

تو مرکزی انجمن خدام القرآن کے جاری کردہ
مندرجہ ذیل خط و کتابت کورسز سے فائدہ اٹھائیے:

(1) قرآن حکیم کی فکری و عملی راہنمائی کورس

(2) عربی گرامر کورس (I`II`III) (3) ترجمہ قرآن کریم کورس

مزید تفصیلات اور پراسپکٹس (مع جوابی لفافہ) کے لئے رابطہ:

شعبہ خط و کتابت کورسز

قرآن اکیڈمی' 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور